نو لکھی کوٹھی: ہندوستانی تہذیب کا بیانیہ

Nau-Lakhi Kothi: A Narrative of Subcontinent Culture.

ڈاکٹر محمد یار گوندل
استاد شعبہ اُردو اور مشرقی زبانیں، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

Abstract:

Nou-Lakhi Kothi is the first novel of Ali Akbar Natiq, published in ۲۰۱۴.Basically he is a poet. His two books of poetry have been published and well received by the critics. This article presents a cultural analysis of his novel "Nou-Lakhi Kothi"."Nou-Lakhi Kothi" is a face of subcontinent's social, political, religious and cultural history. This study focuses on presentation of subcontinent society and its multiple aspects in novel. This article will also highlight the facts and effects of colonialism in subcontinent.

کلیدی الفاظ: شمس الرحمان فاروقی، مرزا اطہر بیگ، مبین مرزا، انگریز دشمنی، کانگریس۔

کسی بھی زبان و ادب میں ناول کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ گو آج کے تیز رو تکنیکی دور میں قلتِ وقت سے ادب کے قارئین ضخیم ناول کے مطالعے کے متحمل نہیں ہو سکتے، جیسے شمس الرحمن فاروقی کے ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" اور مرزا اطہر بیگ کے ناول، بالخصوص "غلام باغ" وغیرہ۔ طویل غزل اور خط کی طرح طویل ناول بھی بے کیفی کی کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔ جس طرح قاری طویل جملے کے اختتام پر پہنچتے

پہنچتے آغاز بھول چکا ہوتا ہے، یہی صورتِ حال کچھ اِس قسم کے ناولوں کے ساتھ بھی پیش آتی ہے۔ اسی حوالے سے مبین مرزا لکھتے ہیں کہ:

> "کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اردو میں اب تک کوئی بڑا ناول نہیں لکھا جا سکا۔۔۔میں نے اس رائے کو ایک سوال کی صورت عصر حاضر کے ممتاز ادیب انتظار حسین کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے جواباً جو کچھ کہا، وہ ہم سے واقعی اس سلسلے میں سنجیدگی سے غور و فکر کا مطالبہ کرتا ہے۔ انہوں نے کہا، ہمارے دماغوں میں "وار اینڈ پیس" پھنس گیا ہے۔ بڑے ناول کا تصور یہ بن گیا ہے کہ وہ ضخیم ہو اور ایک بڑے تاریخی عہد کا احاطہ کرے۔ اپنے جواب میں انھوں نے ایک سوال بھی جڑ دیا، یہ کہ کامیو کا "اجنبی" کیسا ناول ہے، بڑا ناول ہے یا چھوٹا؟۔۔۔لہذا ہمیں انتظار حسین کی اس رائے کو تسلیم کرنا چاہیے کہ کسی بھی ناول کے بڑا قرار پانے کے معیارات اور شرائط کچھ اور ہوتے ہیں۔ محض ضخامت اور وسیع تاریخی دورانیہ کسی ناول کو بڑا ثابت کرنے کا جواز نہیں بن سکتے"۔(۱)

زبان و ادب میں ناول ایسی صنف ادب ہے جس میں ادب برائے ادب اور ادب برائے مقصد، دونوں نظریات پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ ناول میں ناول نگار اپنے نقطہ نظر یا نظریہ حیات کے کسی خاص زاویہ کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے:"ناول بھی سماجی فلسفے کی ایک کتاب ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فلسفے کی کتابوں میں منطقیانہ انداز ہوتا ہے، لیکن ناول میں قصہ گوئی کا انداز اختیار کیا جاتا ہے"۔(۲)

ناول "نولکھی کوٹھی" جسے علی اکبر ناطق نے لکھا ہے، ایک معتدل دورانیے کا ناول ہے۔ جس میں انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کی تقریباً آٹھ دھائیوں کا برصغیر اپنی تہذیب و ثقافت کے ساتھ جلوہ افروز نظر آتا ہے۔ اس ناول کے مطالعے سے برصغیر کی نئی نسل کو اپنے ماضی سے بھرپور شناسائی کا موقعہ ملتا ہے۔ بظاہر ایک مسلمان اور سکھ کرداروں کے آپسی تنازعے کے کینوس پر برصغیر کی تہذیب و ثقافت، کلچر، سیاست، معاشرت، مذہبیت، طرزِ بود و باش، رسم و رواجات، نو آبادیات اور اس کے مثبت اور منفی رجحانات سامنے آتے ہیں۔ یہ دو رخہ ناول ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف انگریز کی حکومت، اس کے ہتھ کنڈے، طریق کار اور دیسی باشندوں کے ساتھ اس کا رویہ، جیسے امور سامنے آتے ہیں وہی برصغیر کے مقامی لوگوں کی خصلتوں، رسم و رواجات اور دیگر رویے بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس لیے اس ناول کو نو آبادیاتی تناظر میں تو رکھا جا سکتا ہے لیکن "نو آبادیات" کا استعارہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ گو ناول میں نو آبادیاتی نظام کی خباثتیں بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ساتھ ساتھ اس کے مثبت پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نو آبادیات کی اصطلاح میں ایک نفسیاتی تاثر پایا جاتا ہے کہ انگریز نے برصغیر کو کالونی بنا کر اپنا الّو

سیدھا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں سرا سر اسی کا فائدہ ہے۔ بظاہر "نولکھی کوٹھی" بھی نوآبادیات کا استعارہ ہے اور ناول کا قصہ بھی اسی کے گرد بنا گیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ایک ولیم نامی انگریز ہے، جس کے دادا نے اپنی مستقل رہائش برصغیر میں ہی اختیار کرلی ہے۔ ولیم برطانیہ سے انڈین سول سروس میں منتخب ہو کر فیروز پور میں بطور اسسٹنٹ کمشنر تعینات ہوتا ہے۔ اس کے اندر اپنے علاقے کی بہبود کا جذبہ پایا جاتا ہے اور اس کا بنیادی سبب برصغیر کی مٹی سے اس کا پیار ہے۔ یہ دھرتی اس کی جائے پیدائش ہے۔ اس لیے وہ اس کی ترقی کا خواہاں ہے۔ ناول نگار نے اس کردار کے ذریعے ایک طرف انگریز کی روایتی سوچ کو دکھایا ہے اور دوسری طرف اپنے علاقے کی بہتری کے لیے اس کے اقدامات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ولیم کے باپ کا چار کنال کا بنگلہ ہے جس کی تعمیر پر اس وقت نولاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ اسی حوالے سے ناول نگار نے لکھا ہے کہ:

> "ولیم کا بنگلہ کم از کم چار کنال کے رقبے میں تھا۔ انگریز نے برطانیہ کے تنگ رقبے اور لندن کے چھوٹے چھوٹے فلیٹس کا غصہ ہندوستان کی دور تک پھیلی ہوئی ہموار زمینوں پر نکالا تھا۔ تنگ گلیوں اور کوارٹروں سے نکلنے کے بعد جب اس نے اتنی کھلی زمینیں اور رقبے بے مصرف پڑے دیکھے جس کا تصور بھی یورپ نہیں کرسکتا تھا، تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ انہوں نے وہ سارا احساسِ محرومی یہاں نکالا۔ کئی کئی ایکڑ پر بنگلے اور ڈسٹرکٹ کمپلیکس بنا دیے۔ جن کے تیار کرنے میں اُنھیں باہر سے کچھ بھی نہ خرچ کرنا پڑا تھا"(۳)

اسی طرح انگریز کا مقامی باشندوں کے ساتھ رویہ اور ان کی بعض عادات کو برا محسوس کرنے کا رجحان بھی نظر آتا ہے۔ وہ دیسی باشندوں کی بعض عادات واطوار اور رسوم ورواجات کو غلط سمجھتے ہیں اور اُن سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ جیسے ولیم نے دورے کے دوران محسوس کیا کہ کام کرنے والے کچھ لوگوں کی نظر ان پر پڑ چکی ہے اور وہ اپنا کام چھوڑ کر اسے بغور دیکھنا شروع ہو گئے ہیں۔ ولیم کو ان کی یہ عادت بری لگی۔ خاص کر ہندوستانیوں کی، چاہے وہ مسلمان ہوں یا سکھ، اُن کی اس مشترکہ عادات سے اسے سخت نفرت تھی۔ وہ کسی بھی چیز کو عجوبے کی طرح دیکھنے کے عادی ہیں۔ پھر اس کے بارے میں انتہائی بے ہودہ اور غلط مگر حتمی تاویلیں کرنے کے ماہر بھی۔ اِسی طرح دیسی لوگوں کی جہالت کا ذکر جہاں وہ فضول رواجات میں مقید ہو کر بے جا اصراف کرتے نظر آتے ہیں:

> "بہت سی بڑی بوڑھیوں کے گھگھرے بھی بندھے تھے، جن کے گھیر کا پھیلاؤ کم از کم تین تک تھا۔ انہیں دیکھ کر ولیم کے ذہن میں ایسے ہی ایک خیال آیا کہ اتنے کپڑے سے تو دو میموں کا لباس بن جائے۔ یہ بوڑھیاں کتنا کپڑا ضائع کرتی ہیں"۔(۴)

انگریز حکام اپنے قوانین پر سختی سے عمل کرنے اور کروانے کے اُصول پر کاربند تھے اور یہی اُن کی کامیاب حکمرانی کا سبب بھی تھا۔ آج بھی ہمارے ہاں وہ لوگ جنھوں نے اُس دور کو دیکھا ہے، کہتے ہیں کہ انگریز اپنے قانون پر کبھی سمجھوتا نہیں کرتا تھا اور غریب کو بھی انصاف ملتا تھا۔ اصل میں قانون کی عمل داری پر ہی مستحکم حکومت کا انحصار ہوتا ہے اور یہ بات انگریز خوب جانتا تھا۔ یوں قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کسی میں جرات نہیں ہوتی تھی۔ ناول میں جب غلام حیدر اپنے وکیل سے قانون سے انحراف کرنے کا عندیہ دیتا ہے تو وکیل شیخ مبارک حسین اُسے سمجھاتے ہوئے کہتا ہے:

> "انگریزی قانون ایک بم ہے۔ اسے جس گدھے نے دولتی ماری، اس کے پرخچے اُڑ گئے۔ تم نہیں جانتے مگر میرا تجربہ بتاتا ہے کہ انگریز اپنے قانون میں کسی کی مداخلت جائز سمجھ لیتا تو ہندوستان میں ایک لمحے کے لیے راج نہ کر سکتا"۔(۵)

انگریز افسران کے رویے کے بارے میں بھی ہمیں آگاہی ہوتی ہے۔ مثلاً جب ولیم اپنے ڈپٹی کمشنر سے ملنے اس کے دفتر جاتا ہے تو ڈپٹی کمشنر اُسے کہتا ہے کہ ولیم جانتے ہو؟ مجھے اُس وقت اپنی خوشامد اچھی لگتی ہے جب کوئی میرا انگریز جونیئر کرتا ہے ورنہ دیسی افسر تو بنے ہی خوشامد کے لیے ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ انگلستان کے باشندوں، خاص طور پر خواتین کا برصغیر کے بارے میں طرح طرح کے سہانے خواب دیکھنا، کا ذکر بھی بڑی مہارت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ وہاں کے لوگ سرزمین ہند کو فیری لینڈ اور سونے کی چڑیا سمجھتے تھے اور ہندیاترا اُن کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہوتی تھی۔ مثلاً ولیم کی شادی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ناول نگار لکھتا ہے۔

> "ویسے بھی ولیم سے شادی کرنا کیتھی کے لیے کسی پرنس کا ہاتھ آجانے سے کم نہ تھا۔ جس کا خواب انگلستان کی اکثر لڑکیاں وہاں دیکھتی رہ جاتیں۔ ہندوستانی سول سروس میں کسی انگریز کے ساتھ بیاہ کرنا ایسے ہی تھا جیسے شاہی خاندان کی بہو بن جانا ہو۔ اس لیے انگلستان میں رہنے والی نوعمر لڑکیاں اس تاک میں رہتیں کہ کسی طرح سی ایس ایس کرنے والے لڑکے کو پھانس لیا جائے۔ ایک دفعہ ایسا لڑکا ہاتھ میں آجاتا تو اُس کی زندگی سنور جاتی۔ پھر وہ ہندوستان پہنچ کر ایک دم میم بن جاتی اور واپس اپنی سہیلیوں کو یہاں کے واقعات اور عیش و عشرت کی زندگی کے عجب عجب قصے لکھ کر بھیجتیں، جن کو پڑھ کر اُن کے کلیجوں میں سیخیں لگتیں"۔(۶)

اسی طرح کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو جس میں بدیسی حکمرانوں کے دبدبے کا انداز نظر آتا ہے دیسی باشندوں کی نفسیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انگریز حکام نے اپنے رُعب اور دبدبے کے لیے نفسیاتی حربے بھی

استعمال کیے تا کہ لوگ اپنا حق مانگتے ہوئے بھی ہچکچاتے رہیں۔ اِسی لیے وہ مقامی باشندوں کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ حاکم اور محکوم کے درمیان فاصلے کو وہ ضروری خیال کرتے تھے:

"باتیں کرنے کے ساتھ ولیم کمرے کا جائزہ بھی لیتا جارہا۔ ہیلے کی میز اور کمرے کی اندرونی ہیئت واقعتاً برطانوی ایمپائر کی ہیئت کی عکاس تھی۔ دس فٹ لمبی اور چھ فٹ چوڑی میز کے ایک کونے پر رکھا ہوا گلوب کچھ معنی رکھتا تھا۔ کمرہ انتہائی کھلا اور آرائش میں پُر وقار چیزوں کی نشان دہی کر رہا تھا۔ پردوں سے لے کے صوفوں تک اور سامنے کی دیوار پر برطانیہ کی وسیع سلطنت کے پھیلے ہوئے نقشے کسی بھی ملاقاتی کے دل پر حکومت کی جلالت اور اس کے نمائندے کی ہیبت پیدا کرنے کے لیے کافی تھے"۔(۷)

دیسی باشندوں کی نفسیات پر بھی اِن لوگوں کی نگاہ تھی کہ اِن کو کیسے مطیع اور زیر کرنا ہے۔ ایک دفعہ ولیم کو ڈپٹی کمشنر اِسی حوالے سے کہتا ہے:

"ولیم حاکم اور محکوم میں ایک فاصلہ ہوتا ہے۔ اُسے قائم رکھنا حاکم کی ذمہ داری ہے۔ دیسی لوگوں کو انصاف فراہم کرو لیکن عدل کے دوران تمہارا ظالم اور مظلوم سے فاصلہ برابر ہونا چاہیے۔ اُن کے درمیان فیصلہ کر کے دونوں سے بے تعلق ہو جاؤ۔ اگر مقامی سے سو دفعہ ملو تو ہر بار اجنبی کی طرح۔ کیوں کہ تمھاری قربت اُسے تمھاری ہیبت سے باہر کر دے گی اور یہ بات قانون کو چھوٹا کرنے کے لیے کافی ہے"۔(۸)

ناول میں جا بجا دیسی لوگوں کی ذہنی سوچ کی جھلکیاں بھی ہمیں نظر آتی ہیں کہ کس طرح وہ حکومت کے ہر اقدام کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ لوگ حکومت کے فلاحی کاموں کو بھی اپنے خلاف سازش سمجھتے تھے۔ مثلاً جب انگریز نے نہری نظام متعارف کرایا تو لوگوں نے اسے بھی اپنے خلاف سازش سمجھا اور اپنے کھیتوں کو پانی دینے سے گریز کرنے لگے۔ اِس حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"نہر کا پانی فصلوں کو لگنے نہیں دیتے۔ اُن کے خیال میں گورنمنٹ نے نہر کے پانی میں ایسی دوائی ملا رکھی ہے جس سے فصلوں میں بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ جب اُس فصل کا غلہ لوگ استعمال کرتے ہیں تو وہ بیماری لوگوں میں پھیل جاتی ہے۔ یعنی انسان نامرد ہو جاتا ہے اور نسل آگے نہیں بڑھتی۔ اِس لیے یہ لوگ نہر کا پانی ہی فصلوں کو لگنے نہیں دیتے اور مکمل طور پر بارشوں کے سہارے رہتے ہیں"۔(۹)

ولیم کو تحصیل دار بتاتا ہے کہ یہاں کے زمین دار سمجھتے ہیں کہ نہری پانی سے گورنمنٹ معاوضہ لے گی تو اسی ڈر سے ایک زمین دار نے اپنی بیسوں ایکڑ کھڑی چاول کی فصل کاٹ کر اپنے مویشیوں کو کھلا دی تاکہ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔ تو ولیم ان کی باتوں پر حیرانی کے ساتھ ہنس دیا، پھر تحمل سے بولا:

"مالیکم صاحب آپ مجھے بتایئے اگر یہ قوم اتنی جاہل اور سادہ نہ ہوتی تو کیا ہم پندرہ بیس ہزار لوگ اِن کروڑوں گدھوں پر حکومت کرسکتے تھے؟ اِن کی یہی بات تو آپ کے لیے نعمت ثابت ہوئی۔ لیکن اب ہمی نے اِن کو تعلیم دینی ہے، اِنھیں سکھانا ہے۔ اِن کی معاشی اور ذہنی ترقی کی ذمہ داری ہم پر ہے"۔(۱۰)

اب ولیم کی مقامی لوگوں کی حالتِ زار اور زمینوں کو بنجر دیکھ کے جو تاثرات اُس کے ذہن میں ابھرے وہ اِن لوگوں کی فلاح و بہبود کے تھے۔

"ولیم کو یہ سب دیکھ کر شدید کوفت کا احساس ہو رہا تھا۔ اُسے دل ہی دل میں اُن سابقہ اسسٹنٹ کمشنروں پر غصہ آ رہا تھا، جنہوں نے اِس علاقے میں ذرا بھی ترقی کا کام کرنے یا لوگوں کو کام پر اکسانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ آفیسر محض یہاں افسری کرنے کے لیے آتے رہے تھے جیسے پورے جلال آباد کو شکار گاہ بنانا چاہتے ہوں۔ جہاں اُن کے کتے خرگوش اور سؤروں کے پیچھے لمبی دوڑیں بھاگ سکیں۔ اُس نے سوچا کہ اگرچہ اس کو تاہی میں مقامی لوگوں کا بھی نقصان ہے مگر حقیقتاً گورنمنٹ کا نقصان بڑے پیمانے پر تھا۔ کیوں کہ علاقہ جس قدر غیر آباد ہوتا، حکومت کو خراج اور مالیے کا نقصان اتنا ہی زیادہ تھا"۔(۱۱)

دراصل ولیم ایک انگریز ہونے کے باوجود اپنی جنم بھومی سے بھی شدید لگاؤ رکھتا ہے۔ وہ ہندوستان کو اپنا ملک سمجھتا ہے۔ اِس لیے وہ ہر وقت اس کی بہتری کے لیے کوشاں رہتا ہے وہ اس حوالے سے اہلِ ہند کی تعلیم، بالخصوص مسلمانوں کی تعلیم کے لیے وہ خصوصی اقدامات کرتا ہے تاکہ ان کی حالت سدھر سکے۔ اِس حوالے سے وہ مولوی کرامت کی تنخواہ میں اضافہ بھی کرتا ہے اور ترقی بھی دلواتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کے لیے کوشش کرتا ہے۔ اسی حوالے سے ناول نگار لکھتا ہے کہ:

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اب تو ہندوستان اُس کا اپنا ملک تھا۔ پچھلی چار نسلوں سے اس کا خاندان اسی کی مٹی سے اپنا رزق اٹھاتا رہا اور اب تو اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون یہیں کے پانی اور سبزے سے تیار ہوا تھا۔ اُسے لندن سے صرف اتنی ہی ہمدردی تھی جتنی ڈیڑھ سو سال کے مہاجرین کی نسلوں کو اپنے سابقہ وطن سے ہوسکتی ہے۔ ولیم نے اپنی زندگی کے بیشتر سال لاہور کے مال روڈ اور منٹگمری کی نہروں کے کناروں پر دوڑتے ہوئے گزارے تھے۔ اُس نے سوچا اس کا دادا یہیں پیدا ہوا، باپ نے یہیں پر جنم لیا تھا اور وہ خود اِسی مٹی سے پھوٹا۔ اب کون

ہے، جو اُسے کہے کہ ہندوستان اُس کا اپنا ملک نہیں ہے۔ وہ ہر حالت میں یہاں رہے گا اور انہی لوگوں کے لیے کام کرے گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے"۔(۱۲)

فنی حوالے سے دیکھا جائے اِس ناول میں آج کے ناولوں کی طرح ژولیدگی کا عنصر نہیں پایا جاتا۔ آج کے ناول میں کہانی یا قصہ پن کا عنصر عنقا ہوتا جا رہا ہے، جس کی طرف انتظار حسین نے بھی اشارہ کیا ہے۔

"ناول اور افسانے میں کہانی تقریباًرخصت ہو چکی ہے۔ آج کل کہانی محض ایک بہانہ بن کر رہ گئی ہے۔اِس بہانے سے ناول نگار کوئی دوسری ہی بپتا سناتا ہے۔ آج کے ناول کے تانے بانے میں کہانی کوئی ایسی اہمیت اور باعزت حیثیت نہیں رکھتی بلکہ بعض ناول بھی لکھے گئے ہیں جن میں کہانی سرے سے غائب ہے۔ناول کے اس بدلتے رجحان نے اکثریت کو حواس باختہ کر دیا ہے۔وہ اس تبدیلی کو اس کی موت کی علامت تصور کرتے ہیں"۔(۱۳)

جدید دور میں جو چیز ناول میں پائی جانی چاہیے اور پائی جا رہی ہے جیسا کہ مرزا اطہر بیگ کے ناول "غلام باغ" اور "حسن کی صورتِ حال (خالی جگہ پُر کرو)" وغیرہ میں جس کا تذکرہ انتظار حسین نے بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"آج ناول جس بے تکے انداز سے شروع ہوتا ہے اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔اس میں الجھنیں سمٹ اور سلجھ کر کسی منطقی انجام تک نہیں پہنچتیں۔اس کے برخلاف آخر میں الٹا ایک اور الجھن کا اضافہ ہو جاتا ہے۔یعنی ناول کا خاتمہ الجھنوں کے سلجھنے پر نہیں بلکہ ایک نئی الجھن کے آغاز پر ہوتا ہے"۔(۱۴)

"نولکھی کوٹھی" میں کہانی اور قصہ پن موجود ہے۔اس کا پلاٹ سادہ ہے۔بظاہر اس ناول کی کہانی دو مرکزی کرداروں کی باہمی آویزش کے گرد گھومتی ہے۔ایک کردار جو مسلمان ہے اور جس کا نام شیر حیدر ہے اور دوسرا سکھ کا کردار ہے جس کا نام سودا سنگھ ہے۔دونوں کی آپس میں خاندانی دشمنی چلی آرہی ہے۔اپنے علاقے کی چوہدراہٹ اور اپنی انا کی تسکین کے لیے یہ ہر وقت بر سرِ پیکار رہتے ہیں۔یہ سپاٹ کردار ہیں۔ان میں ارتقا نہیں۔شروع سے لے کے آخر تک ان میں کوئی اندرونی تبدیلی نہیں آتی۔البتہ اِن کرداروں کے ذریعے اُس وقت کے ماحول اور منظر نامے کو پوری طرح اجاگر کیا گیا ہے۔اُس دور کے رسوم ورواجات، تہذیب وتمدن اور عقائد ومیلانات کے بارے میں بھرپور معلومات ملتی ہیں۔اس میں مقامی اور بدیسی لوگوں کی سوچ کا انداز اور اُن کے خیالات و نظریات کا عکس بھی نمایاں نظر آتا ہے۔شیر حیدر کا ملازم رفیقا پاولی نمک حلالی کا استعارہ ہے۔ ضمنی کرداروں میں یہ ایک نمایاں کردار ہے۔شیر حیدر کے لیے اس کی ذات ایسے ہی ہے جیسے اکبر اعظم کے کسی نورتن کی۔البتہ مکالماتی حوالے سے ان کرداروں کی اپنی اہمیت ہے۔یہاں قاری کو ایک طرح کا تمثال کاری کا انداز نظر آتا ہے۔گو اس کا تعلق فنِ شاعری سے ہے لیکن اِس ناول میں کرداروں کی

حسبِ حال گفتگو اور مکالمہ اِس کا عمدہ نمونہ پیش کرتا ہے۔ ناول میں تمثال کاری کرداروں کی زبان، حرکات وسکنات اوران کے ظاہر کے ساتھ ساتھ اُن کے باطن کی بھی موثر عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ اس ناول میں ناول نگار نے بیانیہ اِس طرح بُنا ہے کہ اِس کے کردار حقیقی زندگی کے جیتے جاگتے کردار نظر آنے لگتے ہیں۔ ناول کے بیانیہ میں آمد کا عنصر نظر آتا ہے جس کی بناپر، آگے کیا ہوتا ہے کا تجسس قاری کو اس مطالعے پر مجبور کرتا ہے۔ اِن دو کرداروں کے علاوہ دواور کردار بھی نمایاں ہیں جن کی فعالی حیثیت کی بناپر شیر حیدر اور سوداسنگھ کے کردار دب جاتے ہیں

۔ اِن میں ایک ولیم کا کردار ہے اور دوسرا مولوی کرامت کا۔ ناول کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ناول نگار نے اِن کرداروں کے ذریعے اپنانقطہ نظر اور نظریہ حیات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ولیم کے ذریعے ہندوستانی معاشرے کے خدوخال جس میں دیسی معاشرت کی تمام جزئیات کو سمیٹ کرر کھ دیا ہے اور ساتھ ہی انگریز حکومت کا اندازاوراس کا دیسیوں کے بارے میں رویہ بھی اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ آخر میں جب تقسیمِ ہند کے بعد ولیم طرح طرح کے مصائب میں گھر جاتا ہے۔ وہ پاکستان کو اپنا ملک سمجھتا ہے اور دوستوں ، حتیٰ کہ اپنی بیوی کے اصرار کے باوجود برطانیہ واپس نہیں جانا چاہتا۔ اُس کی بیوی کیتھی بھی اُسے چھوڑ کر یورپ چلی جاتی ہے۔ اُسے ملازمت سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں اور آخر کار اُس سے اُس کی آبائی کوٹھی بھی چھین لی جاتی ہے اور وہ انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ مولوی کرامت کا کردار سب سے نمایاں ہے۔ یہ کردار اپنے دادا مولوی خدایار اور والد مولوی احمد دین سے شروع ہو کر مولوی کرامت کے بیٹے فضل دین اور پھر مولوی کرامت کے پوتے نوازالحق تک پہنچتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اِن میں تبدیلیاں بھی رونما ہوتی جاتیں ہیں۔ اپنی محنت اور دانش مندی کی بناپر غربت سے آسودگی کی طرف سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اِن کے خیالات و نظریات میں بھی تبدیلی آتی جاتی ہے۔ مولوی کرامت کے کردار کے ذریعے دیسی لوگوں کے مذہب، تعلیم اور معاشرت کے بارے میں خیالات کو آشکار کیا گیا ہے۔ مولوی کرامت کے کردار میں قدامت پسندی اور جدت پسندی، دونوں کی لہریں ساتھ ساتھ بہہ رہی ہیں۔ ناول کے آخر میں اِس کردار کو استعاراتی انداز میں آگے بڑھایا گیا ہے۔ یہ کردار زمانے کا نبض شناس ہے اور بہت کم وقت میں ترقی کی منازل طے کر لیتا ہے۔ یوں اِس ناول میں مولوی کرامت اور ولیم کا کردار اہم ہو جاتے ہیں اور شیر حیدر اور سوداسنگھ کے کردار روایتی کرداروں کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ بہادری اور دلیری ہی اِن کا طرہ امتیاز ہے۔ البتہ شیر حیدر کے کردار کا خاتمہ اِس انداز سے ہوتا ہے کہ وہ بعد میں بھی قارئین کو یاد رہتا ہے۔ جب تقسیمِ ہند کے موقعے پر خالصہ فوج کے کمانڈر کو گولی مار کر قتل کر دیتا ہے جو پاکستان سے بھارت جانے والوں کو تو پُل سے گزرنے دیتا ہے جب کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کو روکے

رکھتا ہے۔ یوں شیر حیدر کا کردار بھی یادگار کردار بن جاتا ہے۔ ناول میں عمدہ جزئیات نگاری نظر آتی۔ معمولی اور روزمرہ جزئیات سے بھی قاری کو اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ جزئیات ایسی عمدہ کہ ایک جملہ تو دور کی بات، ایک لفظ بھی زوائد میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ اِسی طرح محاکات نگاری بھی اپنے کمال کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ خاص طور پر جہاں موسموں، فصلوں، آب و ہوا اور دیسی اور انگریز حکام کی ملاقاتوں کے مناظر میں جزئیات نگاری کے ساتھ ساتھ محاکات نگاری بھی موجود نظر آتی ہے۔ مثلاً فصلوں کے پکنے کے ذکر پر اُن کی مہک اور خوش بو کا احساس خود بخود قاری کو ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح موسموں کے بیان پر، گرمی، سردی، برسات، بہار اور خزاں اپنی پوری توانائیوں اور احساس کے ساتھ ہمارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اُس وقت قاری پر بھی ویسا ہی موسم اثر انداز ہونا شروع ہو جاتا ہے جیسا کہ ناول کے بیانیہ میں بیان ہوا ہوتا ہے۔ شائد اس کا سبب یہ بھی ہے کہ علی اکبر ناطق پہلے شاعر اور بعد میں ناول نگار کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ اِس ناول کے آنے سے پہلے اُن کی شاعری کے دو مجموعے "بے یقین بستیوں" اور "یاقوت کے ورق" اور ایک افسانوی مجموعہ "قائم دین" شائع ہو چکے ہیں۔ یوں ان کی نثر میں بھی لفظوں کا انتخاب اور ایجاز و اختصار پایا جاتا ہے۔ یہاں طوالت کے باوجود ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ناول نگار نے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ہماری سیاسی تاریخ کی ایک دھائی (۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۷ء) کو ایک پیراگراف میں مقفل کر دیا ہے۔ یہ اقتباس ایجاز و اختصار اور استعاراتی انداز کی عمدہ مثال ہے۔ مولوی کرامت کا پوتا نواز الحق پہلے نائب تحصیل دار پھر تحصیل دار اور جلد ہی اسسٹنٹ کمشنر بن جاتا ہے۔

> "اُن کے تحصیل دار بننے کے کچھ عرصے بعد ملک میں فوج کی حکومت آگئی۔ نواز صاحب اُن دنوں خوش قسمتی سے ضلع راولپنڈی کے محکمہ مال میں تھے۔ یہ حکومت ہر لحاظ سے شرعی کہی جا سکتی تھی۔ تمام سزائیں شرعی ہوگئی تھیں۔ لباس شرعی ہو گیا۔ ٹوپیاں، تسبیاں، لوٹے اور چٹائیوں کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ شلواریں گھٹنوں کے اُوپر۔ حتیٰ کہ سر کے بال اور ڈاڑھیاں شریعت کے مطابق ڈھل گئیں۔ گاؤں گاؤں میں مولویوں کے وظائف مقرر کر دیے گئے اور انہیں خطبے لکھے لکھائے آنے لگے تاکہ کسی بھی مولوی کو دماغ پر زور دینے کی زحمت نہ پڑے۔ ہزاروں چوہڑے بطور جلاد بھرتی کئے گئے، پھر بھی کوڑے مارنے والے کم پڑ جاتے تھے۔ عوام کا نماز اور روزے کی طرف اتنا رجحان ہو گیا کہ سرزمین جنت نشان ہو گئی۔ ہر طرف امن و امان کی فضا قائم ہو گئی۔ تبلیغی مرکزوں میں، جہاں کبھی ویرانی ہو سکتی تھی، اب کھوے سے کھوا چھلنے لگا۔ عدل و انصاف کا اس قدر بول بالا ہوا کہ جرم کے شبے کی بنا پر بھی سزائے موت دی جانے لگی اور اس معاملے میں اتنی احتیاط تھی کہ چاہے مجرم وزیر اعظم ہی کیوں نہ ہو، تختے پر چڑھا دیا جاتا۔ دراصل عدالتوں نے پتا چلا لیا تھا کہ سوائے فوجی اور ایک خاص مکتبہ فکر کے

مولوی کے، باقی لوگ کافر اور غدار ہیں۔ تمام بدعتی مذاہب اور مسالک کا قلع قمع کرنے کی ٹھان لی گئی اور صحابہ کے سچے پیروکاروں اور خفیہ اداروں کو اجتماعی طور پر پورے اختیار دے دیے گئے کہ وہ آسانی سے نشاۃ اسلامیہ کے دشمنوں کی سرکوبی کر سکیں، یہی وہ دن تھے، جب نوازالحق صاحب پر صحیح دین کی سمجھ اور فوجی حکومت کی برکتوں کے پے بہ پے انکشافات ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف خود، بلکہ لوگوں کی بھی اس امر کی طرف توجہ دلانی شروع کر دی کہ امیر المومنین جنرل صاحب اللہ کے ولی اور مجدد دین ہیں۔ اُن کے حکم کی سرتابی خدا سے بغاوت کے مترادف ہے اور یہ کہ جمہوریت مغرب کا پراپیگنڈہ ہے۔ اسلام ایسی کسی حکومت کو جائز قرار نہیں دیتا جس کی بنیاد غیر مذہبوں نے رکھی ہو۔ انہوں نے علی الاعلان یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ رافضی اور خانقاہی نظام، دین میں فساد کا دوسرا نام ہے، چنانچہ اُنھیں بالکل ختم کر دینا چاہیے۔ اِس عرصے میں نواز صاحب نے اپنی ڈاڑی مزید بڑھا لی اور رضاکارانہ طور پر دفتر میں کام کرنے والوں کو نماز پڑھانے کے ساتھ دین کی صحیح سوجھ بوجھ دینا بھی شروع کر دی۔ جس کی اُس وقت اُن لوگوں کو سخت ضرورت تھی۔ جو آدمی نماز پڑھنے نہ آتا، اُسے دفتری قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کا نام دے کر وارننگ لیٹر جاری کرنے کا اہتمام بھی ہونے لگا۔ اس میں بھی نواز صاحب سب سے زیادہ پیش پیش تھے۔ اس کے ساتھ ہی فوجیوں سے مراسم اور لاہور کی نہایت شریف فیملی، جس پر جنرل صاحب کی برکات بے پایاں تھیں، کے درِ دولت پر دن رات حاضری کو اپنا ایمان اور کعبہ کی زیارت کے مترادف جان لیا۔ اور اُن نامرادوں کے نام اور کوائف دینے لگا، جو سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر فوج یا اسلام کے خلاف بات کرتے پائے جاتے تھے۔ نواز صاحب میں اِن سب خوبیوں اور اسلام کے سچے عاشق ہونے کی وجہ سے، یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ حساس اداروں کی نظر سے اُس کی وفاداری اوجھل جاتی۔ بالآخر اس کا نام اُن افراد کی فہرست میں شامل ہو گیا، جنھیں بلاشبہ غیر مشروط طور پر حکومت کے وفاداروں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس شریف فیملی کی غلام گردشوں میں پھرتے نواز صاحب نے اپنی ترقی کے ایک اور زینے کی راہ دیکھ لی۔ بالآخر پنجاب کی وزارتِ خزانہ کی سفارش سے انہیں سربیاسی میں اُس کی اسسٹنٹ کمشنری کے آرڈر جاری ہو گئے۔ انھیں پورے سرکاری پروٹوکول کے ساتھ جھنگ شہر کی افسری کا پروانہ دے دیا گیا، جہاں دیگر کاموں کے ساتھ بعض مسالک اور اُن کے عقائد کے خلاف کام کرنے والوں کے لیے آسانیاں فراہم کرنا تھیں''۔(۱۵)

یہ ناول اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ آج کی نژاد نوجو اپنے ماضی کے تہذیبی ورثہ سے بیگانہ ہو چکی ہے، اِس ناول کے مطالعے سے اپنے ماضی کی تہذیب و ثقافت سے بھرپور شناسائی حاصل کر سکتی ہے۔ اِس ناول

کے مطالعے سے قاری کے تاریخی شعور کو بھی جِلا مل سکتی ہے۔ کسی بھی ناول کی کامیابی کے انحصار میں اُس کے اسلوبِ بیاں کی اہمیت بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ عبدالقادر سروری نے کہا ہے کہ:

"فنی تکمیل سے ہماری مراد نہ صرف ضروریاتِ ناول نگاری پر خیال رکھنا بلکہ اسلوبِ بیان پر بھی زور دینا ہے۔ ناول میں بھی مثل نظم کے کوئی جملہ ایسا نہ ہونا چاہیے جس کی بندشِ الفاظ پست نہ ہو اور ایک لفظ بھی ایسا نہ ملے جس پر کافی غور و خوض نہ کر لیا گیا ہو۔" (۱۶)

ناول کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ اِس کی زبان خواص و عوام دونوں کے لیے یکساں ہے اور یہ نثر میں "آمد" اور بے ساختگی کا عمدہ نمونہ ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ مبین مرزا، جدید اُردو ناول: چند سرسری تاثرات، مشمولہ، مکالمہ ۱۱، ص ۳

۲۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی، ادب اور اقدار، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۹۸ء، ص ۲۷۴

۳۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، (لاہور: سانجھ پبلیکیشنز، ۲۰۱۴ء) ص ۶۹

۴۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۵۔ ایضاً، ص ۱۶۲

۶۔ ایضاً، ص ۲۷۱

۷۔ ایضاً، ص ۲۹

۸۔ ایضاً، ص ۳۰

۹۔ ایضاً، ص ۲۲۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۲۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۱۳۔ انتظار حسین، ناول میں کہانی کا عنصر، مشمولہ، ماہ نو، (لاہور، جلد ۰۷، شمارہ ۰۲، فروری ۲۰۱۵ء) ص ۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۶

۱۵۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، محولہ بالا ۳، ص ۴۰۰۔۴۰۱

۱۶۔ عبدالقادر سروری، دنیائے افسانہ، (حیدرآباد: مکتبہ ابراہیمیہ، ۱۹۲۷ء) ص ۱۷